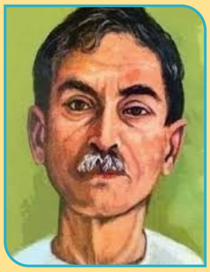

منشی پریم چند (دھن پت رائے)

- پیدایش : ۱۸۸۰ء بنارس (ہندوستان)
- وفات : ۱۹۳۶ء وارانسی (ہندوستان)
- تصانیف : سوزِ وطن، زادِ راہ، واردات، آخری تحفہ، پریم چالیسی، فردوسِ خیال، خواب و خیال(افسانے)، بیوہ (ڈراما)

زیور کا ڈبّا

حاصلاتِ تعلّم

یہ سبق پڑھ کر طلبہ : (۱)اصنافِ نثر کی تعریف کرسکیں اور ان میں امتیاز کرسکیں۔
(۲)ذاتی واقعات و مشاہدات تحریر کرسکیں۔(۳)جماعت میں لیکچروں کو سمجھ کر اُن کے چیدہ چیدہ نکات ڈائری میں نوٹ کرسکیں۔
(۴) مختلف اسالیب کی تحریریں مرتب کرکے پیش کرسکیں۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ ان کی ماں پہلے ہی مرچکی تھی۔ اسی سال والد بھی چل بسے، اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا، وہ مٹی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ عہدے پر تھے۔ ان کی وَساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی مگر وہ سب منصوبے دھرے رہ گئے اور اب گزر اوقات کے لیے صرف تیس روپے ماہ وار کی ٹیوشن ہی رہ گئی ۔والد نے کوئی جائیداد نہ چھوڑی۔ بیوی بھی ملی تو تعلیم یافتہ، شوقین، زبان کی طرّار، جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مرجانا قبول تھا۔ چندرپرکاش کو تیس کی نوکری کرتے شرم آتی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لیے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیے۔یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے بالکل مِلا ہُوا تھا، پختہ، ہوا دار، صاف ستھرا، اور ضروری سامان سے آراستہ۔ ایسا مکان بیس روپے ماہ وار سے کم میں نہ مل سکتا تھا۔ کام صرف دو گھنٹے کا تھا۔ لڑکا تو لگ بھگ اُنھی کی عمر کا تھا مگر بڑا کُند ذہن، کام چور۔ ابھی نویں درجے میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزّت کرتے تھے بلکہ اپنا ہی لڑکا سمجھتے تھے۔ گویا ملازم نہیں بلکہ گھر کا آدمی تھا اور گھر کے ہر ایک معاملے میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

شام کا وقت تھا، پرکاش نے اپنے شاگرد، ویرِاندر کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی تو ٹھُکرائن نے کہا : ”ابھی نہ جاؤ بیٹا، ذرا میرے ساتھ آؤ، تم سے کچھ کہنا ہے۔“ پرکاش نے دل میں سوچا، وہ کیا بات ہے جو ویرِاندر کے سامنے نہیں کہی جاسکتی ۔ پرکاش کو علاحدہ لے جاکر اُمادیوی نے کہا: ”تمھاری کیا صلاح ہے،

ویرو کا بیاہ کردوں، ایک بہت اچھے گھر کا پیغام آیا ہے۔“

پرکاش نے مسکراکر کہا: ”یہ تو ویرو بابو ہی سے پوچھیے۔“

”نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔“

”جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں۔“

”تو کر ڈالوں ؟ مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے، پھر پچھتانا پڑے گا۔“

”میرے رہتے ہوئے تو آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہاں ! مرضی ہو تو کر ڈالیے، کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔“

”سب تیاریاں تمھیں کرنا پڑیں گی یہ سمجھ لو۔“

”تو میں کب انکار کرتا ہوں۔“

بات پکّی ہوگئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے تھے جنھیں اپنے اوپر بھروسا نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہ میں پرکاش کی ڈگری اپنےساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھوں میں تھا۔ دس بارہ ہزار روپے خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزّت کی بات نہیں تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمے دار مینیجر بن بیٹھا ہے۔ کہیں بزّاز اسے سلام کرنے آیا ہے۔ کہیں محلّے کا بنیا گھیرے ہوئے ہے۔ کہیں گیس اور شامیانے والا خوشامد کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تو دو چار سو روپے آسانی سے اُڑا سکتا تھا۔ اتنا کمینہ نہ تھا۔ پھر اس کے ساتھ دغا کرے جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑدیا ہو۔ مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیورات خریدے اس کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آکر چمپا سے بولا : ”ہم تو یہاں روٹیوں کے محتاج ہیں اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں روپے کے زیورات بنوا ڈالتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لیے پانچ ہزار کے زیور خریدے ۔ ایسی ایسی چیزیں کہ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں۔ سچ کہتا ہو ں کہ بعض پر تو آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔“

چمپا حاسدانہ لہجے میں بولی: ”اونہہ ! ہمیں کیا کرنا ہے، جنھیں ایشور نے دیا ہے وہ پہنیں۔ یہاں تو رو رو کر مرنے کو پیدا ہوئے ہیں۔“

چندر پرکاش بولا: ”یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں۔ باپ دادا چھوڑ گئے ہیں مزے سے کھاتے اور چین کرتے ہیں۔“

چمپانے کہا ”میں تو اسی سوچ میں ہوں کہ ٹھکُرائن کے یہاں شادی میں کیسے جاؤں گی۔ سوچتی ہوں بیمار پڑ جاتی

تو جان بچتی"۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

چندرپرکاش: "یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ زندہ رہا تو ایک دن سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہوگی۔"

چمپا مسکرا کر بولی: "چلو ایسی من کی مٹھائی میں نہیں کھاتی، گزر ہو جائے۔ یہی بہت ہے۔"

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے پھر زیوروں کا ذکر چھیڑا۔ زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے، "اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں، مجھے اس کی اُمید نہ تھی۔"

چمپا نے کہا: "کوئی اور بات کرو۔"

"ایسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو۔"

"زیوروں سے کیا خوب صورتی معلوم ہوتی ہے۔"

رات کے بارہ بج گئے ہیں۔ پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آتی۔ بار بار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کچھ بادل گھِر آئے ہیں اور بار بار بجلی چمک اٹھتی ہے۔ یکا یک پرکاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر چھت پر آیا تھا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس چھت سے ملی ہوئی تھی۔ بیچ میں ایک پانچ فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

دھوپ نکل آئی تھی۔ پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا: "بڑا غضب ہوگیا۔ رات کو ٹھاکر صاحب کے گھر میں چوری ہوگئی۔ چور زیوروں کا ڈبّا اُٹھاکر لے گئے۔"

پرکاش نے پڑے پڑے پوچھا: "کسی نے پکڑا نہیں چور کو۔"

"کسی کو خبر بھی نہیں، وہی ڈبّا لے گئے جس میں شادی کے زیور رکھے تھے۔ نہ جانے کیسے چابی اُڑالی۔ اور انھیں کیسے معلوم ہوا کہ اس صندوق میں ڈبّا رکھا ہے۔"

"نوکروں کی کارستانی ہوگی۔ باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے۔"

"نوکر تو ان کے تینوں پرانے ہیں۔"

"نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے، آج موقع دیکھا، اُڑالے گئے۔"

”تم جاکر ان کو تسلی دو ٹھکُرائن بے چاری رو رہی تھیں۔ تمھارا نام لے کر کہتی تھیں : ”بے چارا مہینوں ان زیوروں کے لیے دوڑا۔ ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی اور چورمونڈی کاٹے نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔“

پرکاش جھٹ پٹ اٹھ بیٹھا اور گھبرایا ہوا سا جاکر ٹھکُرائن سے بولا : ”یہ تو بڑا غضب ہوگیا،ماتا جی ! مجھے تو ابھی ابھی چمپا نے بتلایا۔“

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے، بولے : ”کہیں سیندھ نہیں، کوئی تالا نہیں ٹوٹا، کسی دروازے کی چول نہیں اتری ،سمجھ نہیں آتا چور آیا کدھر سے ؟“

ٹھکُرائن نے رو کر کہا : ”میں تو لٹ گئی بھیا، بیاہ سر پر ہے، کیا ہوگا بھگوان۔ تم نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی، تب کہیں جاکر چیزیں تیار ہو کر آئی تھیں۔“

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا: ”مجھے تو کسی نوکر کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔“

ٹھکُرائن نے مخالفت کی : ”ارے نہیں بھیا ! نوکروں میں کوئی نہیں۔ دس دس ہزار روپے یوں ہی اوپر رکھے رہتے ہیں۔ کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا۔“

ٹھاکُر صاحب نے ناک سکوڑکر کہا: ”تم کیا جانو، آدمی کا دل کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔ جس نے ابھی تک چوری نہیں کی وہ چوری نہیں کرے گا۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں پولیس میں رپورٹ کروں گااور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا۔ مال اڑا دیا ہوگا۔ جب پولیس کے جوتے پڑیں گے تو آپ اقبال کریں گے۔“

پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا۔ کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں تو ستم ہی ہوجائے گا۔ بولے : ”پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرنا بالکل بے فائدہ ہے۔“

ٹھاکُر صاحب نے منھ بنا کر کہا : ”تم بھی کیا بچوں کی سی بات کررہے ہو پرکاش بابو ! بھلا چوری کرنے والا خود بہ خود اقبال کرلے گا ! ہاں تم زدوکوب بھی نہیں کرسکتے! پولیس میں رپورٹ کرنا مجھے بھی فضول معلوم ہوتا ہے، مال چلا گیا، اب کیا ملے گا۔“

پرکاش : ”لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔آپ بیٹھ رہیے لیکن میں بیٹھنے والا نہیں۔ میں انھیں نوکروں کے سامنے چور کا نام نکلواؤں گا۔“

ٹھکُرائن : ”نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے۔ کسی کا نام بھی نکل آئے تو مجھے یہی خیال رہے گا کہ یہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے۔ چاہے جدھر سے آیا ہو پر، چور آیا باہر سے۔“

ٹھاکر : ”ہاں ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو شاید کچھ نشان ملے۔ کل دروازہ تو کھلا ہوا نہیں رہ گیا ؟“

پرکاش کا دل دھڑکنے لگا، بولا : ”میں تو دس بجے دروازہ بند کرلیتا ہوں۔ ہاں کوئی پہلے سے موقع پاکر کوٹھے پر چلا گیاہواور وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو تو دوسری بات ہے“۔ جہاں پرکاش کا پاؤں پڑا تھا، وہاں کا چونا لگ جانے سے چھت پر پاؤں کا نشان پڑگیا تھا۔ پرکاش کی چھت پرجاکر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دیے۔ ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی: ”اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا۔“

ٹھاکُر صاحب نے کہا : ”ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں ، لیکن اتنا پتا لگ جانے سے کیا ۔ مال تو جانا تھا وہ گیا۔ اب چلو آرام سے بیٹھو۔“

پرکاش : ”میں آج ہی گھر چھوڑ دوں گا۔“ ٹھاکر : ”کیوں ہمیں تمھارا ۔۔۔“

پرکاش : ”آپ نہ کہیں لیکن میں سمجھتا ہوں، میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آگئی، میرا دروازہ تو دس بجے تک کھلا ہی رہتا ہے۔ چور نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ ممکن ہے دو چار روز میں پھر آگھسے۔ گھر میں اکیلی ایک عورت ہے، سارے گھر کی نگرانی نہیں کرسکتی۔ادھر وہ تو باورچی خانے میں بیٹھی ہے ادھر کوئی چپکے سے اوپر بڑھ گیا تو ذرا بھی آہٹ نہیں مل سکتی۔ میں گھوم گھام کر کبھی نو بجے آیا، کبھی دس بجے اور شادی کے دنوں میں دیر ہوتی رہے گی۔ادھر کا راستہ ہی نہیں ہونا چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں چوری کی ساری ذمّے داری میرے سر ہے۔“

ٹھکُرائن ڈریں : ”تم چلے جاؤ گے، بھیّا ! تب تو گھر اور پھاڑ کھائے گا۔“

پرکاش : ”کچھ بھی ہو ماتا جی۔ مجھے بہت جلد گھر چھوڑ دینا پڑے گا۔ میری غفلت سے چوری ہوگئی۔ اس کا مجھے خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔“

پرکاش چلا گیا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا : ”بڑا لائق آدمی ہے ۔“

پرکاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر میں رہنے میں خدشہ تھا، لیکن جب تک شادی کی دھوم دھام رہی، اکثر تمام دن یہیں رہتے تھے۔

اب تک پرکاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا۔ پرکاش کے پاس جو کچھ تھا وہ چمپا کا تھا۔ چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک، صندوق اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں۔ مگر اب پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا تھا۔ اس کی چابی کہاں تھی اس کا چمپا کو پتا نہیں، وہ پوچھتی ہے : ”اس صندوق میں کیا ہے ؟“ تو وہ کہہ دیتے ہیں :

"کچھ نہیں، پرانی کتابیں ہیں ماری ماری پھرتی تھیں، اٹھا کے صندوق میں بند کردی ہیں۔" چمپا کو شک کی گنجایش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انھیں پان دینے گئی، تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ فق ہوگیا۔ شبہے کا اکھوا نکلا مگر پانی بہہ کر سوکھ گیا۔ چمپا کسی ایسے راز کا خیال ہی نہ کرسکی جس سے شبہے کو غذا ملتی۔

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں دیکھ نہ لے پرکاش کو چین کہاں۔ چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی۔ وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں، پکوڑیاں گرم گرم ہی مزا دیتی ہیں۔ پرکاش کو پکوڑیاں پسند بھی بہت تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے لگی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کردیا اور تالا لگا کر اسے بہلانے کے لیے بولا: "طشتری میں کیا لائیں؟ آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔"

ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آنکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خرید لی اور صندوق کھول ڈالا۔ ارے یہ تو زیور ہیں۔اس نے ایک زیور نکال کر دیکھا۔ یہ کہاں سے آگئے! مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی۔معاً اس کے دل میں یہ خیال گذرا یہ زیورات ٹھاکر صاحب کے تو نہیں! چیزیں وہی تھیں جن کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ اسے اب کوئی شک نہیں رہا۔ لیکن اتنی بڑی شرم و ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔اس نے ایک دم صندوق بند کردیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ان کی اتنی ہمت پڑی کیسے؟ یہ کمینہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لیے انھیں تنگ نہیں کیا۔ ان کا ضمیر اتنا کم زور کیوں ہوگیا؟

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے وہ محبت نہ رہی، نہ وہ عزّت کا جذبہ، بات بات پر تکرار ہوجاتی۔ پہلے دونوں ایک دوسرے سے دل کی بات کہتے تھے۔مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے، آپس میں ہم دردی تھی مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ شہر کے ایک بینک میں اسسٹنٹ مینیجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاش نے اکاؤنٹنٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا، لیکن شرط یہ تھی کہ نقد دس ہزار روپے کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے، پرکاش تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک روز ٹھاکر صاحب سے اس معاملے پر بات چیت چل پڑی ٹھاکر صاحب نے کہا: "تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟"

پرکاش نے سر جھکا کر کہا: "دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں؟"

"اجی درخواست تو دو، اگر اور سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔"

پرکاش نے حیران ہو کر کہا : ”آپ ضمانت داخل کردیں گے ؟“

”ہاں ہاں یہ کون سی بڑی بات ہے۔“

پرکاش گھر کی طرف چلا تو بڑا اُداس تھا۔ اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی، مگر پھر بھی وہ خوش نہیں ہے۔ ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور ان کے اس پر اتنے زبردست اعتماد سے اسے دلی صدمہ ہورہا ہے۔

اس نے گھر آکر چمپا کو خوش خبری سنائی۔ چمپا نے سن کر منھ پھیر لیا، پھر ایک منٹ بعد بولی :
”ٹھاکر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی؟ آدمی کی نیت بھی تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔“

پرکاش سناٹے میں آگیا۔ اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہوا۔ چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا؟ کھانے کے وقت پرکاش نے چمپا سے پوچھا : ”تم نے کیا سوچ کر کہاکہ آدمی کی نیت تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی ؟“ (جیسے اس کی زندگی اور موت کا سوال ہو۔)

چمپا نے آزردہ ہوکرکہا : ”کچھ نہیں میں نے دنیا کی بات کہی تھی۔ تم تو زبان پکڑتے ہو، ٹھاکر صاحب کے ہاں شادی میں ہی تم اپنی نیت ٹھیک نہ رکھ سکے۔اِن چھے مہینوں میں انھوں نے تمھارے ساتھ کیا کیا سلوک کیے۔ کچھ دیا ہی ہے ، مکان تم نے خود چھوڑا۔ لیکن وہ بیس روپے ماہ وار دیے جاتے ہیں۔علاقے سے کوئی سوغات آتی ہے، تمھارے ہاں ضرور بھیجتے ہیں۔ تمھارے پاس گھڑی نہ تھی، اپنی گھڑی تمھیں دے دی۔ تمھاری کہارن جب ناغہ کرتی ہے، خبر پاتے ہی اپنا نوکر بھیج دیتے ہیں۔ میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس انھوں نے ادا کی اور دن میں دو دفعہ پوچھنے آیا کرتے تھے۔ یہ ضمانت کی کیا چھوٹی بات ہے؟ اپنے رشتے داروں تک کی ضمانت جلدی سے کوئی دیتا ہی نہیں۔ تمھاری ضمانت کے لیے نقددس ہزار روپے نکال کردے دیے۔ اسے تم چھوٹی بات سمجھتے ہو ؟ آج تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کے روپے تو ضبط ہوجائیں۔ جو آدمی ہمارے اوپر اتنی مہربانی کرے اس کے لیے ہمیں جان قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“

پرکاش کھانا کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کررہا تھا۔ دل کی سیاہی اس وقت سامنے آتی ہے جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کے رکھ دیتا ہے۔ تب ہمارے منھ سے نکل پڑتا ہے، افسوس ! چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بیدار کردیا۔ وہ صندوق کئی گنا بھاری ہوکر پتھر کی طرح اسے دبانے لگا۔

پرکاش کو بینک میں ملازمت مل گئی۔ اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے۔ ٹھاکر صاحب، ان کی اہلیہ، وِیرانِدَر اور اس کی نئ دُلھن بھی آئے ہوئے ہیں ۔ باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔

پرکاش نے کہا: ”آج آپ کو یہاں رہنا ہوگا۔ دادا میں اس وقت نہ جانے دوں گا۔“ چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی۔ چارپائیاں نہیں ہیں۔ بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے۔ رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت، اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہوگئے۔

بارہ بجے تھے، ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدے میں۔ تینوں عورتیں اندر کمرے میں تھیں۔ پرکاش جاگ رہا تھا۔ ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا، پرکاش نے گچھا اٹھا لیا، پھر کمرہ کھول کر اس میں سے زیورات کا ڈبّا نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ کئی ماہ پیش تر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا۔ اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھر تھرا رہے تھے لیکن تب کانٹا چبھنے کا درد تھا، آج کانٹا نکلنے کا تب بخار کا چڑھاؤ تھا حرارتِ اضطراب اور خلش سے پُر، اب بخار کا اتار تھا، سکون، فرحت اور اُمنگ سے بھرا ہوا، تب قدم پیچھے ہٹا تھا لیکن آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے کمرا کھولا اور اندر جاکر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبّا رکھ دیا، پھر فوراً باہر آکر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ پڑا۔

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔ پرکاش شام کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا۔ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہاں آج کیا گُل کِھلتا ہے۔

وِیراِندَر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا: ”بابو جی کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی۔ جو زیورات چوری ہوگئے تھے سب مل گئے۔“

ٹھاکر صاحب بھی آگئے، اور بولے: ”بڑی مبارک دعوت تھی تمھاری۔ زیور کا پورا ڈبّا مل گیا۔ ایک چیز بھی نہیں گئی، جیسے امانت رکھنے کے لیے ہی لے گیا ہو۔ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری کیا ہوا مال چھے ماہ بعد مل جائے اور جُوں کا تُوں۔“

ڈبّا کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا: ”تعجب کی بات ہے ۔۔۔میری عقل تو کام نہیں کرتی۔“

ٹھاکر: ”کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی! تمھاری ہی کیوں؟ وِیرُو کی ماں تو کہتی ہے کوئی غیبی معجزہ ہے۔ آج سے مجھے معجزات پر یقین ہوگیا۔“

پرکاش: ”اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔“

ٹھاکر: ”آج اس خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہوگی۔“

پرکاش : ”آپ نے کوئی منتر ونتر تو نہیں پڑھوا لیا کسی سے ؟“

ٹھاکر : ”کئی پنڈتوں سے۔“

پرکاش بولا : ”تو بس یہ اسی کی برکت ہے۔“

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خوش خبری سنائی۔ وہ نہ جانے کیوں رونے لگی، جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدّت کے بعد گھر آگیا ہو۔

پرکاش نے کہا : ”آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے۔“

”میں بھی ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔“ چمپا نے کہا۔ ”تم تو سیکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو۔“ پرکاش بولا۔

”مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ لاکھوں روپے خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہوگا۔“ چمپا بولی۔

پرکاش کی آنکھوں میں آنسو آگئے !

(ماخوذ از :زادِ راہ)

مشق

سوال نمبر ا : درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(ا) چندر پرکاش نے عملی زندگی کا آغاز کس طرح کیا ؟
(۲) کس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹھاکر صاحب چندر پرکاش پر اعتماد کرتے تھے؟
(۳) چندر پرکاش کے ذہن میں بے ایمانی کا خیال کیسے آیا ؟
(۴) چندر پرکاش نے ٹھاکر صاحب کا گھر کیوں چھوڑا ؟
(۵) ٹھاکر صاحب کے چندر پرکاش پر کسی ایک احسان کی تفصیل بتائیے۔
(۶) چندر پرکاش اور اُس کی بیوی کے کرداروں کا تقابل کیجیے۔
(۷) چمپا کو ایسا کیوں محسوس ہوا کہ اس کا بچھڑا ہو خاوند بہت مدت کے بعد گھر آیا ہے؟
(۸) افسانہ نگار نے زندگی میں سچّی خوشی حاصل کرنے کا کیا طریقہ بتایا ہے؟

سوال نمبر۲ : درج ذیل اقتباسات کی تشریح بہ حوالۂ سیاق و سباق کیجیے:

(الف) "پہلے دونوں مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے، آپس میں ہم دردی تھی مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں بات بھی نہ ہوتی۔"

(ب) "اس کے پاؤں تھرتھرا رہے تھے لیکن تب کانٹا چبھنے کا درد تھا، آج کانٹا نکلنے کا سکون، فرحت اور امنگ سے بھرا ہوا، تب قدم پیچھے ہٹا تھا لیکن آج آگے بڑھ رہا تھا۔"

سوال نمبر۳ : افسانے "زیور کا ڈبّا" کی تلخیص تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۴ : افسانے "زیور کا ڈبّا" کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۵ : کیا یہ افسانہ آپ کے شعور میں اضافے کا سبب بنا؟ کیسے ؟

سوال نمبر۶ : آپ کو اس افسانے کے کس کردار نے متاثر کیا اور کیوں ؟

سوال نمبر۷ : ذیل کے الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

صلاح	خستہ حال	اُڑا لینا	کارستانی	دوڑ دھوپ
لحاظ	جواب دہی	دھوم دھام	ضمیر	گُل کھلنا

سوال نمبر۸ : درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:

شیریں	امانت	انسانیت	محتاج	ستم

سوال نمبر۹ : دُرست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(۱) چندر پرکاش کو رہنے کے لیے مکان دیا:
(الف)خان صاحب نے (ب)ٹھاکر صاحب نے (ج)شیخ صاحب نے (د)مرزا صاحب نے

(۲) ٹھاکر صاحب کے بیٹے کا نام تھا:
(الف)کرشن (ب)درشن (ج)ویراندر (د)ویراد

(۳) زیورات کی مالیت تھی:
(الف)چار ہزار روپے (ب)پانچ ہزار روپے (ج)چھے ہزار روپے (د)سات ہزار روپے

(۴) پرکاش سے بینک والے ضمانت مانگ رہے تھے:
(الف)پانچ ہزار کی (ب)دس ہزار کی (ج)بیس ہزار کی (د)تیس ہزار کی

(۵) "زبان پکڑنا" ہے:
(الف)مثال (ب)تشبیہ (ج)روزمرّہ (د)محاورہ

سرگرمیاں

- طلبہ کمرۂ جماعت میں پرکاش کے کردار کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کریں گے۔
- طلبہ مختصر لیکچر کی شکل میں اِس افسانے کے کسی ایک فکری یا فنی پہلو پر روشنی ڈالیں گے۔
- طلبہ افسانے میں موجود روزمرّہ اور محاورے تلاش کریں گے۔

افسانہ : افسانے سے مراد ایسی مختصر کہانی جو ایک نشست میں پڑھی جا سکے اور اس میں زندگی کے کسی ایک پہلو کو بے نقاب کیا گیا ہو۔ افسانے کے فن میں پلاٹ، کردار، زمان و مکاں، مرکزی خیال اور اسلوب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اردو میں افسانہ انگریزی زبان و ادب کے وسیلے سے آیا ہے۔

برائے اساتذہ

- طلبہ کو افسانے کی صنف کے بارے میں بتائیے۔
- طلبہ کو بتائیے کہ فکشن کی مختلف اصناف ہماری زندگی کی عکاس ہوتی ہیں اور اُن میں بیانیہ یا علامتی پیرائے میں زندگی کی تنقید بھی موجود ہوتی ہے۔
- طلبہ کو اس افسانے میں موجود زبان و بیان کی خوبیاں بتائیے۔
- طلبہ کو روزمرّہ، محاورے اور ضرب المثل کا فرق سمجھائیے۔